Subject:	**Urdu**
Module:	**14**
Paper:	**Mersia Nigari**
Topic:	**Meer Hasan Ki Masnawi Nigari**
Content writer:	**Professor Kauser Mazhari**
	Jamia Millia Islamia, New Delhi
PI:	**Professor Mazhar Mehdi Hussain**
	Jawaharlal Nehru University, New Delhi

میر حسن کی مثنوی نگاری

(Introduction)تعارف/تمہید

اردو میں مثنوی نگاری کی تاریخ بہت مستحکم رہی ہے۔ دکنی مثنوی کے علاوہ شمالی ہند میں فائز دہلوی سے لے کر میر تقی میر، سودا،شاہ حاتم، شاہ مبارک آبرو، مصحفی، راسخ عظیم آبادی، مومن خاں مومن تک مثنوی نگاری کی ایک مضبوط اور خوبصورت بلکہ لائق توجہ روایت رہی ہے۔ میر حسن بھی شمالی ہند کے شعرا میں ہیں اور دہلی سے گہری نسبت رہی ، یہ الگ بات ہے کہ وہ فیض آباد اور لکھنؤ بھی گئے۔

شمالی ہند میں میر حسن کی مثنویوں کی جو خوبیاں ہیں ان کی تفہیم و تعبیر میں ان کے عہد اور دوسرے شعرا سے ان کے امتیازات پر یہاں روشنی ڈالی جائے گی۔ انھوں نے جہاں حکمت اور پند و موعظت کے موضوعات پر مثنویاں کہی ہیں وہیں انھوں نے عشقیہ رنگ کی مثنویاں بھی کہیں ہیں۔ یہاں خصوصی طور پر ان کی تین مثنویوں :رموزالعارفین، گلزارِ ارم اور سحرالبیان سے بحث کی جائے گی۔

سبق کا مقصد (Learning Outcome)

اس سبق میں میر حسن کے اسلوب شعر پر روشنی ڈالی جائے گی۔ انھوں نے گیارہ مثنویاں تحریر کی ہیں۔ لیکن چوں کہ ان کی زیادہ تر مثنویاں مختصر ہیں، اس لیے کوشش یہ کی جائے گی کہ سب سے زیادہ مثنوی ‘سحرالبیان’ پر توجہ کی جائے اور اس کا جواز یہ ہے کہ سحرالبیان کے تئیں پوری اردو تنقید مثبت اندازمیں رطب اللّسان ہے۔ سچائی بھی یہی ہے کہ میر حسن نےاس

مثنوی کی تخلیق میں اپنی پوری تخلیقی ہنرمندی صرف کردی ہے۔ یہاں اس سبق کا مقصد یہ بھی ہے کہ سحرالبیان کی تجزیاتی تنقید سے میر حسن کی مثنوی نگاری کی مکمل تصویر سامنے آسکے۔

ذیلی عنوان(1) میر حسن کی مثنویوں کی تعداد

میر حسن نے گیارہ مثنویاں تحریر کیں جن میں سے گلزارِ ارم، سحرالبیان اور رموز العارفین طویل ہیں جبکہ بقیہ دوسری مختصر ہیں۔ مثنویوں کی فہرست یہ ہے: قصاب کی نقل، کلانوت کی نقل، دواحمق دوستوں کی نقل، مثنوی شادی، رموزالعارفین، گلزارِارم، درتہنیت عید، قصر جواہر، خوان نعمت، ہجو حویلی میر حسن، سحرالبیان۔

ذیلی عنوان(2) میر حسن کی مثنوی نگاری

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ میر حسن نے گیارہ چھوٹی بڑی مثنویاں لکھی ہیں۔ یہاں میر حسن کی سب سے مشہور مثنوی 'سحرالبیان'کے ساتھ ساتھ 'گلزارِ ارم' اور'رموزالعارفین' پر بھی قدرے روشنی ڈالی جائے گی۔

رموز العارفین: اس مثنوی کے نام ہی سےاندازہ ہوتا ہے کہ اس کا موضوع تصوف اور رُشد و ہدایت ہوگا۔ اس مثنوی کے آغاز میں شاعر اپنی بات اس طرح شروع کرتا ہے:

عارفوں کو رمز سے ملک درویشی کا مجھ
آگاہ کر کو شاہ کر

شاعری میں عمر میں میں نے عقبیٰ کا کیا
کھوئی تمام ہرگز نہ کام

اپنی اس بے ہودگی پر شعر کہنے سے بھرا
ہوں خجل ہے میرا دل

اس مثنوی میں میر حسن نے بادشاہ ابراہیم ادھم نے بلخ کے سلطنت چھوڑ کر درویش اور فقیری اختیار کرنے کی داستان منظوم کی ہے۔ اس میں میر حسن نے جابہ جا مولانا روم کی مثنوی کے حصے شامل کرلیے ہیں اور خود بھی بہت سے اشعار فارسی میں کہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کہانی پیش کرکے معارف حق اور راہ سلوک کا درس دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ دنیا کی محبت چھوڑ کر خدا کی محبت کا درس اس طرح دیتے ہیں:

جا بتوں سے پہلے اپنا دیکھ تو کرتا ہے پھر
دل لگا کیا کچھ خدا

پہلے ان کی دیکھ لے محبوبیاں تاکہ ہوویں ان کی ظاہر خوبیاں

بیوفائی جب ہو ان کی آشکار ان گلوں سے تیرا دل ہو خار خار

پھر سمجھ تو کچھ کہ دنیا کچھ نہیں گرچہ ہے سب کچھ پہ اپنا کچھ نہیں

سب سے کر دل خالی اور دل میں جدا دل میں اپنے کچھ نہ لا غیر از خدا

رموزالعارفین کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے گیان چند جین نے لکھا ہے کہ:

''رموزالعارفین میں حکمت اور بے ثباتئ دنیا کے مضامین بیان کیے گئے ہیں جن میں ادبیت تو نہیں لیکن پُراثر ضرور ہیں۔ زبان صاف اور سادہ ہے جو اس اس موضوع کے لیے مناسب ہے۔'''' (اردو مثنوی شمالی ہند میں، ص 297)

گلزارِ ارم:

میر حسن نے یہ مثنوی 1192ھ یعنی 1778 میں لکھی۔ گلزار کا املا میر حسن نے 'گلذار' لکھا ہے جس سے اس مثنوی کی تاریخ نکلتی ہے:

سو اس کا نام گلذار ارم گلذار ارم = 1192ھ ہے

اس مثنوی میں میر حسن نے اپنے عشقیہ رنگ کو بھی پیش کیا ہے اور اپنے عہد کے فیض آباد اور لکھنؤ کے نقوش بھی بیان کیے ہیں۔ دہلی سے لکھنؤ آتے ہوئے فیض آباد میں قیام لیکن اس سے پہلے میوات میں شاہ مدار کے مزار کا ذکر، چھڑیوں کا بیان، پھر میوات کی حسیناؤں کی آرائش و زیبائش کا بیان کیا ہے۔ چھڑیوں کا بیان ملاحظہ کیجیے:

ڈفالی واں کھڑی کرتے تھے — وہ چھڑیاں کیا بھلی لگتی تھیں چھڑیاں کھڑیاں

دیا باتی سرشب روز کرتے — دیے چھڑیو ں کے آگے لاکے دھرتے

ضلع بولے ہے کوئی، کہیں ٹھٹھا کہیں ہے دھول
کوئی پھکّڑ دھپّڑ

روا بیچے کوئی، کوئی لیے بیٹھا ہے سانڈے کا کوئی
کرے کھیل تیل

یہاں میلے میں جب میر حسن گھوم رہے تھے، تو ان کی آنکھیں کیا کچھ دیکھ پا رہی تھیں، ان کا ذکر بھی خوبصورت اندازمیں کیا گیا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

کوئی بالے میں لے کر گل کوئی پھول اپنی انگیا میں
بھرے ہے دھرے ہے

کوئی ماتھے پہ ہے ٹیکے کوئی لے ڈھولکی بیٹھی ہے
لگاتی گاتی

کوئی گیندا اچھالے ہے کسی دیے بیٹھی ہے کوئی گال پر
ساتھ ہاتھ

کوئی ہے مست اور کوئی پھرے ہے کوئی جھمکاتی

شرابی گلابی

اسی طرح جب وہ فیض آباد پہنچتےہیں تو وہاں کے میلے ٹھیلے اور بازار کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ میر حسن نے بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ نقشہ پیش کیا ہے۔ وہاں کے روزمروں اور فقروں کی داد دیجیے:

صدا کرتا ہے کوئی ہاتھ اٹھا کے — معطر پھول ہیں جی موتیا کے

کوئی مصری کے گنّے کہہ پکارے — کوئی کہتا ہے میٹھے ہیں کتارے

چنے والا لگا کہنے یہ ہنس کے — کرارے بھُربھُرے نیبو کے رس کے

میر حسن نے لکھنؤ کی بے رونقی دیکھ کر بہت دل برداشتہ ہوئے۔ فیض آباد کی رونق لکھنؤ پر فائق تھی، اس لیے اس مثنوی میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ لکھنؤ کی ہجو اس انداز میں کی گئی ہے:

زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا ہے کہیں اونچا کہیں نیچا رستہ

کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں

ہر اک کوچہ یہاں تک تنگ تر ہے ہوا کا بھی بہ مشکل واں گزر ہے

سیہ گل سے گلی یوں تر رہے ہے بغل جس طرح حبشی کی بہے ہے

اس طرح اس مثنوی میں باضابطہ کوئی داستان نہیں اور نہ اس کے لیے کسی منضبط اور مربوط پلاٹ وضع کیا گیا ہے۔ پھر بھی اس میں زبان کا ایک لطف ضرور ہے۔

مثنوی سحرالبیان: میر حسن کی تمام مثنویوں میں قبول عام اور شہرت دوام اسی مثنوی 'سحرالبیان' کو ملی۔ اسی لیے اس کی طرف توجہ بھی سب سے زیادہ کی گئی۔ یہ مثنوی 1199ھ یعنی 1784 میں مکمل ہوئی لیکن اس کی اشاعت پہلی بار کلکتہ سے 1803 میں ہوئی جو کہ 152 صفحات پر مشتمل تھی۔ فورٹ ولیم کالج سے یہ مثنوی شیر علی افسوس کے دیباچے کے ساتھ

شائع ہوئی تھی۔ اسی سال میر بہادر علی حسینی نے اسے نظم سے نثر میں منتقل کیا۔ بعد میں اس کے ترجمے ہندی اور انگریزی میں بھی ہوئے۔ اس کے بعد پنجابی اور پشتو زبان میں یہ مثنوی شائع ہوئی۔ پہلے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کہانی پیش کردی جائے۔ قصہ یوں ہے:

’’کسی شہر مینوسواد کے بادشاہ کے ہاں بڑی منّتوں اور مرادوں سے لڑکا پیدا ہوا۔ بے نظیر نام، حسن و جمال سے بہرہ مند تھا۔ نجومیوں نے پیشین گوئی کی کہ یہ بارہ سال کی عمرمیں رنج و تعب میں گرفتا رہوگا۔ بارہویں سال کی آخری رات کو شاہزادہ کوٹھے پر چاندنی میں سویا ہوا تھا کہ ایک پری ادھر سے گزری۔ صورت دیکھتے ہی فریفتہ ہوگئی اور شہزادے کو تخت پر اڑا کر پرستان لے آئی۔ شہزادہ ایک رات پری کے دیے ہوئے کل کے گھوڑے پر سیر کرتا ہوا سراندیپ جانکلا۔ یہاں اس کی نظریں سراندیپ کے بادشاہ مسعود شاہ کی گل اندام بیٹی بدر منیر سے چار ہوئیں۔ دونوں گرفتار عشق ہوگئے۔ ادھر ایک دیوانے پری کو اس واقعے کی خبر کردی اور پری نے اس جرم کی پاداش میں شہزادے کو ایک کنویں میں قید کردیا۔ بدرمنیر کی سہیلی وزیرزادی نجم النسا بے نظیر کی تلاش میں جوگن بن کے نکلی اور جنون کے بادشاہ کے بیٹے فیروز بخت کی مدد سے بے نظیر کو رہا کروالائی۔ سب کے برے دن پھرے، بچھڑے ملے۔ بے نظیر

کا بدرمنیر اور فیروزبخت کا نجم النساء سے بیاہ کیا گیا اور بے نظیر خوش و خرم وطن لوٹ آیا۔''

(ماخوذ: ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، از گوپی چند نارنگ، ص 313)

اس مثنوی کی داستان کے بارے میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ طبع زاد ہے۔ لیکن، گیان چند جین نے اپنی کتاب میں ا س بات کا اعادہ کیا ہے کہ مثنوی کا پلاٹ گو بظاہر طبع زاد ہے لیکن اس کے مختلف اجزا الف لیلہ، قدیم فارسی مثنویوں اور داستانوں میں مل جاتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے الف لیلہ اور پھر قصہ چار درویش کے اسلوب اور قصے کے کئی اجزا سے سحرالبیان سے مماثلت کی بات بھی کی ہے۔

مثنوی کے اوزان کے بارےمیں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی سات مخصوص بحریں ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مثنوی سحرالبیان جس بحر میں ہے، اس بحر میں زیادہ تر محاربات یعنی جنگ و جدل کے موضوعات برتے جاتے ہیں۔ لیکن میر حسن نے اسی بحر میں ایک عشقیہ داستان قلم کرکے دکھایا اور اس مفروضے کو غلط قرار دیا۔ اس بحث کا رکن: فعولن فعولن فعولن فعول (متقارب مثمن مقصور یا محذوف)۔ اس کی طرف گیان چند جین نے بھی اشارہ کیا ہے کہ میر

حسن نے اس بحر میں بہترین بزمیہ مثنوی لکھ کر ثابت کردیا کہ کوئی بحر کسی ایک موضوع کے لیے مخصوص نہیں ہوتی۔ نظم کی کامیابی بحر سے زیادہ شاعری کی فکر پر منحصر ہے۔ آئیے اس مثنوی کے مختلف اجزا کا مثالوں کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔

منظر نگاری: منظرنگاری یوں تو خارجی حسن کے بیان کو کہتے ہیں لیکن اس میں جان اور اثرانگیزی پیدا کرنے کے لیے شاعر کی تخلیقی قوت مستحکم ہونی چاہیے ورنہ منظر نگاری ایک سپاٹ تاثر پیش کرسکتی ہے۔ کبھی کبھی ظاہری حسن میں حقیقت کی ایسی تصویر کشی ہوتی ہے کہ دل اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ اس مثنوی میں جو دل کشی اور جاذبیت ہے اور اسلوب میں جو چاشنی ا ور دل ربائی ہے اس کا احساس خود شاعر کو بھی ہے:

ذرا منصفو داد کی ہے یہ جا — کہ دریا سخن کا دیا ہے بہا

ز بس عمر کی اس کہانی میں صرف — تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف

جوانی میں جب ہوگیا ہوں میں پیر — تب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر

نہیں مثنوی، ہے یہ اک پھلجھڑی — مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی

نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں — نہیں مثنوی، ہے یہ سحرالبیاں

بات منظرنگاری کی ہورہی ہے، لہٰذا آپ غور کریں کہ میر حسن نے کس خوبصورتی سے مصنوعی باغ میں بھی خوبصورت رنگ بھر دیا ہے۔ باغ گرچہ ایران کا معلوم ہوتاہے لیکن اس باغ میں ہندوستانی پھول گیندا، موتیا، چمپا، موگرا، مدن وغیرہ بھی اپنی خوشبو بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

گلوں کا لب نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر — نشے کا سا عالم گلستان پر

چمن آتش گل سے دہکا ہوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

ہوا

صَبا جوگئی ڈھیریاں پڑے ہر طرف مولسریوں کے
کرکے بھول پھول

اور پھر یہ اشعار دیکھیے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ موسیقی اور بزم کے عالم میں درختوں اور شام کی منظرکشی کتنی خوبصورت ہے:

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھانوں کی سبزی وہ
وہ دھوپ سرسوں کا روپ

وہ لالے کا عالم ہزارے کا رنگ وہ آنکھوں کے ڈورے نشے
کی ترنگ

گلابی سے ہوجانا دیوار و در درختوں سے آنا شفق کا نظر

وہ چادر کا چھٹنا وہ پانی کا زور ہر اک جانور کا درختوں پہ
شور

میر حسن نے منظرکشی میں کوشش کی ہے کہ صنعتوں کا استعمال نہ ہو یعنی مبالغے، تشبیہ اور استعارے کے بغیر انھوں نے مناظر قدرت کی پیش کش میں ایک طرح کی دل فریبی پیدا کردی ہے:

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بہ جا — وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

وہ سنسان جنگل وہ نور قمر — وہ برّاق سا ہر طرف دشت و در

وہ اجلا سا میداں چمکتی سی ریت — اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

درختوں کے پتے چمکتے ہوئے — خس و خار سارے جھمکتے ہوئے

درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور — گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

آخری شعر میں جو تشبیہ بھی ہے وہ بالکل سامنے کی ہے۔ اور یہ شعر بھی کیا ہی خوب ہے۔ اس مصرع میں کہ 'گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور'ایک ایسا جادو کا سا اثر ہے، ایسا لگتا ہے جیسے واقعی چھلنی سے نور چھن چھن کر گررہا ہو۔ یہی ہے میر حسن کی طباعی اور تخلیقیت۔

میر حسن نے اپنی مثنوی میں انسان کے نجی اور عوامی جذبات و احساسات دونوں کی خوبصورت عکّاسی کی ہے۔ اس جذبات نگاری میں وہی منظرنگاری والی صلاحیت کام کرتی ہے۔ شہزادہ جب گم ہوجاتا ہے اور اس سے جو ماحول بنتا ہے، اس میں جذبات کا اہم رول ہے۔ یہ تین اشعار دیکھیے:

کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دل گیر ہو — گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

رہی کوئی انگلی میں دانتوں کو داب — کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب

اسی طرح جب بارہ برس کے شہزادے کو وطن اور ماں باپ سے دور لے جا کر پرستان میں رکھا جاتا ہے تو اس کی مایوسی اور پریشانی کا نقشہ میر حسن بہت خوبصورت انداز میں پیش کرتےہیں:

وہ محلوں کی چہلیں وہ رہے روبرو دھیان میں
گھر کا سماں ہر زماں

وہ شفقت جو ماں باپ تو راتوں کو رو رو
کی یاد آئے کے دریا بہائے

بہانے سے دن رات نہ ہو جب کوئی تب وہ
سویا کرے رویا کرے

جذبات نگاری میں اگر مزید پختگی اور شدّت دیکھی ہو تو بدر منیر کے احوال سنیے جب وہ جدائی کے کرب سے دوچار ہوتی ہے۔ اس بیان میں بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے لیکن اگر مبالغہ کہیں ہے بھی تو گرانی کا باعث بالکل نہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

خفا زندگانی سے ہونے بہانے سے جا جا کے

لگی سونے لگی

نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا

جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے
محبت میں دن رات گھُٹنا اسے

کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو
تو اٹھنا اُسے کہہ کے، ہاں جی چلو

کسی نے جو کچھ بات کی، بات کی
پہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی

اسی طرح شرم اور حیا کی عکّاسی والے دو شعر دیکھیے:

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے
بدن کو چرائے ہوئے ناز سے

منہ آنچل سے اپنا لجائے ہوئے شرم

چھپائے ہوئے کھائے ہوئے

دراصل جذبات کی عکاسی کے لیے کرداروں کی نفسیات کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔ پھر یہ کہ جس جذبے کو شاعر پیش کرنا چاہتا ہے، اُسی کی مناسبت سے الفاظ بھی لائے جانے چاہیے۔ اس کام میں میر حسن کو پوری طرح قدرت حاصل ہے۔

اب کردار نگاری کا ذکر ضروری ہے کہ مثنوی میں کرداروں کو مستحکم کرنا ضروری ہوتا ہے ۔

میر حسن نے بے نظیر کے کردار کو آغاز میں فعّال اور دل چسپ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن آگے چل کر اس میں ڈھیلا پن اور جھول پیدا ہوگیا ہے۔ اس طرح اس کی ہیروئن بھی کمزور دکھائی دیتی ہے جو ہجر کے کرب کو جھیل نہیں پاتی اور مسلسل اس پر بے ہوشی کا دورہ سا پڑتا رہتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ ملاقات کے بعد وصل کی خواہش اور اس کی طلب سے مغلوب رہتی ہے۔ اس میں ضبط کا مادّہ نہیں۔ اسی طرح ماہ رخ پری بھی عشق کے جذبے سے مغلوب دکھائی دیتی ہے۔ اس میں ایک طرح کی خود پسندی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اُسے ہمیشہ یہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ اس کی خواہش کس طرح پوری ہوسکے۔ کردار نگاری میں ظاہری تحسین

اور بناؤ سنگار کے اظہار میں البتہ میر حسن نے بدر منیر کا نقشہ نہایت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

برس پندرہ ایک کا سِنّ و سال — نہایت حسیں اور صاحب جمال

اُدھر آسماں پر درخشندہ مہ — ادھر یہ زمیں پہ مہِ چار دہ

وہ کرتی و انگیا جواہر نگار — نیا باغ اور ابتدا کی بہار

وہ ساعِد وہ بازو بھرے گول گول — برابر ہو الماس کے جس کا مول

وصل اور وصل کے اسباب مہیا کرنے کرانے میں میر حسن نے بڑی محنت کی ہے۔ بدر منیر کی حالت یوں رہتی ہے:

پہر رات تک ہنسنا اور — درعشق اور حسن کو

بولنا کھولنا

کبھی ہجر سے ان کو کبھی وصل سے بیٹھنا
ہونا ملول پھول پھول

بے نظیر کی جدائی سے جب بدرمنیر پریشان ہوتی ہے تو اس کی بیقراری کم کرنے کی غرض سے وہ جوگن کا روپ لے کر نکل پڑتی ہے۔ اسی لیے لگتا ہے کہ نجم النساء کے کردار میں جان سی پڑگئی ہے۔ اسے خود سے زیادہ دوسرے کی فکر ہوتی ہے:

لگی کہنے وہ یوں نہ ترے واسطے میں نے
آنسو بہا اب دکھ سہا

بس اب سر بہ صحرا اُسے ڈھونڈ لانے کو
نکلتی ہوں میں چلتی ہوں میں

جو باقی رہا کچھ مرے تو پھر آکے میں
دم میں دم دیکھتی ہوں قدم

وگر مرگئی، تو بلا سے تو یوں جانیو مجھ پہ

موئی صدقے ہوئی

پھر اس کا ذکر ہے کہ کس کس طرح سے وہ اپنے لباس کو تار تار کرکے جوگن کا لباس پہن لیتی ہے۔

بدن پر راکھ اور بھبھوت مل لیتی ہے۔ یہ سب کچھ اپنی سہیلی بدرمنیر کے لیے کرتی ہے یعنی اس میں ایثار کا جذبہ ہے۔ شہزادے کی تلاش میں تنہا بھٹکتی ہے مگر ہمیشہ ہر جگہ اعتدال اور توازن کا دامن تھامے رہتی ہے۔

دوسرے کرداروں میں جِنوں کا شہزادہ ہے جو عشق میں گرفتار ہوکر بھی جذباتیت کا شکار نہیں ہوتا۔ اس طرح نجم النساء اور شہزادۂ جن دونوں میں زندگی کو منطقی اور Radical انداز میں جینے کی صلاحیت نظر آتی ہے۔

واقعہ نگاری میں میر حسن نے کمال فن دکھایا ہے۔ چوں کہ انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اس لیے مرقع کشی میں انھیں دقت نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ نگاری بھی منظرکشی کا سا انداز پیش کرتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کھنچی چادر اک اس پہ کہ ہو چاندنی جس صفا کی

شبنم کی صاف غلاف

دھرے اس پہ تکیے کئی کہ مخمل کو ہو جس کے
نرم نرم دیکھے سے شر

اسی طرح واقعہ نگاری کے ذیل میں اس موقع کی ایک تصویر دیکھیے جب شاہزادہ کی پیدائش ہوتی ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسن کو اس فن میں کیسی مہارت تھی:

نئے سر سے عالم کو کہ لڑکے کے ہونے کی
عشرت ہوئی نوبت ہوئی

محل سے لگا تا بہ عجب طرح کا اک ہوا
دیوان عام اژدہام

چلے لے کے نذریں لگے کھینچنے زر کے
امیر و وزیر تودے فقیر

خوشی سے کیا یاں تلک جسے ایک دنیا تھے
زر نثار بخشے ہزار

غرض یہ کہ میر حسن نے اس مثنوی میں واقعہ نگاری کے لوازم کا پورا خیال رکھا اور نبھایا ہے۔ وہ اس کے لیے جزیات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔ رقص اور موسیقی کے ضمن میں اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ ارباب عشرت کا آپس میں مل — جمانا کھڑے راگ کا دے کے دل

وہ ایمن کی تانیں ادھر اور اُدھر — ملے سُر طنبوروں کے با یک دگر

اور اس صف سے اک چھوکری کا نکل — جتانا ہنر اپنا پہلی پہل

الٹنا وہ ٹھوکر کو دے دے کے تال — وہ بوٹا سا قد اور کہروے کی چال

اب ذرا اس مثنوی کی ایک اہم خوبی کی طرف غور کرتے ہیں جسے ہم تہذیبی و ثقافتی رنگ کہتے ہیں۔ یہ مثنوی پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے کردار چاہے ایران کے ہوں مگر اس کی زمین اور بساط ہندوستانی ہے۔ اس کے اندر ہندوستانی رقص و موسیقی سے لے

کر موسم اور پھلوں یا پھر کھانے پینے کی اشیا کے ذکر سے لے کر ملبوسات وغیرہ کے بیان تک، ہر جگہ ایک طرح کا ہندوستانی ماحول دکھائی دیتا ہے۔ ایک رقاصہ شہزدے کی شادی میں کچھ اس انداز میں سامنے آتی ہے:

کھڑے ہو کے دو گھونٹ حقّے کی لے — چبا پان اور رنگ ہونٹوں پہ دے

انگوٹھے کی لے سامنے آرسی — وہ صورت کو دیکھ اپنی گلزار سی

الٹ آستیں اور مہری کا چاک — نئے سر سے انگیا کو کر ٹھیک ٹھاک

بنا کنگھی اور کرکے ابرو درست — جھٹک دامن اور ہو کے چالاک و چُست

دوپٹے کو سر پر الٹ اور سنبھل — یکایک وہ صف چیر آنا نکل

پکڑ کان اور گھنگھروؤں کو اٹھا | پہن پاؤں میں اپنے سر سے چھُوا

آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس میں حقّہ، پان، آرسی، انگیا، کنگھی، دوپٹہ، گھنگرو وغیرہ کا استعمال ہندستانی تہذیبی رنگ کو کس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ بدر منیر کا لباس اور پہناوا قلعہ معلی کی شہزادیوں کاسا ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا کے مدنظر یہ لباس عربی و ایرانی لباس کے مقابلے میں نازک تر اور ہلکا پھلکا ہے (ہندوستانی قصوں سے ماخوذ مثنویاں، ص 314) اس کے علاوہ درج ذیل میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن سے اندازہ ہوگا کہ پہناوا اور زیوروں کو میر حسن نے کس کس طرح پیش کیا ہے:

وہ مِسّی وہ اس کے لب لعل فام | سوادِ دیارِ بدخشاں کی شام

لکھوٹا وہ پانوں کا مِسّی کے ساتھ | کہ جوں دامنِ شب شفق کے ہو ہاتھ

وہ ماتھے پہ ٹیکے کی اس کے جھلک | سحر چاند تاروں کی جیسے چمک

وہ موتی کے مالے لٹکتے ہوئے رہیں دل جہاں سر پٹکتے ہوئے

وہ بھُجبند بازو کے اور نورتن کہ جوں گل سے ہو شاخ زیر چمن

اس تہذیبی زمین پر ہند ایرانی معاشرت کا ملا جُلا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ یعنی اگر ایک طرف ایرانی پھول جعفری، لالہ اور گل شبو اور اشرفی ہیں تو دوسری طرف موتیا، چمپا، چنبیلی، موگرا، مولسری ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی شادی کے رسوم کو میر حسن نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ بقول گوپی چندنارنگ:

> ’’شادی بیاہ کی رسموں میں تو ہندوستانی مسلمانوں کی شاید ہی کوئی رسم ہو جو میر حسن نے نظم نہ کی ہو۔ بے نظیر کی برات کا نقشہ بالکل ہندوستانی شاہی براتوں کا سا ہے۔ آتش بازی کی رونق، باجوں کا شور، روشنی کی چمک دمک، دلھن کے گھر برات کی پیشوائی، مجرا، کھتوڑیاں، شہانے، سمدھنوں کے تڑاکے، آرسی مصحف، سرونج پسوانا، نبات چنوانا، ٹونے سلونے، منڈھا اور رخصتی غرض ایک ایک رسم گن گن کر بیان کردی ہے۔‘‘

(ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، ص 318)

آخر میں یہ ضروری ہے کہ میر حسن کی مثنوی نگاری اور بالخصوص ’ سحرالبیان‘کے حسن اور اس کی شہرت کے پیچھے کارفرما زبان اور طرز اظہار کا جائزہ پیش کیا جائے۔

’ سحرالبیان ‘ کی زبان میں چُستی اور روزمرہ اور محاورے کے سبب دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔ اگر آپ میر حسن کے زمانے میں دیکھیں تو زبان بہت بالیدہ اور پختہ نہیں تھی، تاہم میر حسن نے زبان اور تراکیب کا جو خوبصورت استعمال دکھایا ہے، وہ لائق توجہ ہے۔ سید محمد عقیل لکھتے ہیں:

’’میرحسن نے جو زبان اور جیسا بھی انداز بیان اختیار کیا وہ نہایت سلیس، عام فہم، حسب موقع جامعیت لیے سحرالبیان میں نظر آتا ہے۔ ان کے الفاظ، خود ان کے کرداروں کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔‘‘

یوں تو شاعری کی کوئی بھی صنف ہو، مگر مثنوی کے لیے بالخصوص اسلوب اظہار میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ساتھ برجستہ اور برمحل محاوروں اور روزمرہ کا استعمال اور اہتمام ضروری ہوتا ہے۔ میر حسن نے اپنے کردارو ں کے مطابق زبان اور روزمرہ کا استعمال کیا ہے جس کے سبب

اس میں اثرانگیزی اور حسن اعجاز پیدا ہوگیا ہے۔ بدر منیر جب بے نظیر کے ہجر میں بے قرار ہوتی ہے اور اس کی سہیلی نجم النسا اُسے تسلّی دیتی ہے، تو اس موقع پر دیکھیے میر حسن کا اسلوب اظہار:

پلا ساقیا ساغرِ بے نظیر پھنسی دام ہجراں میں بدر منیر

محبت کا سودا سا ہونے لگا جنوں تخمِ وحشت کا بونے لگا

یہ احوال دیکھ اس کا، دخترِ وزیر لگی جل کے کہنے کہ بدر منیر!

مسافر سے کوئی بھی کرتا ہے پیت مَثل ہے کہ ’جوگی ہوئے کس کے میت‘

شاہزادے کو کوٹھے سے پری جب لے جاتی ہے تو سب پریشان اور حیرت زدہ ہوجاتے ہیں۔اس منظرکی عکاسی کے لیے میر حسن کا اسلوب اظہار دیکھیے:

نہ ہے وہ پلنگ اور نہ نہ وہ گل ہے اس جا،

وہ ماہ رو نہ وہ اس کی بو

رہی دیکھ یہ حال حیران کہ یہ کیا ہوا ہائے کار پروردگار

کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی کوئی ضعف ہو ہو کے گرنے لگی

کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب کسی نے کہا: گھر ہوا یہ خراب

سُنی شہہ نے القصہ جب یہ خبر گرا خاک پر کہہ کے ہائے پسر

کلیجا پکڑ ماں تو بس رہ گئی کلی کی طرح سے بکس رہ گئی

یہاں اس بات کا ذکر بھی اہمیت کا حامل ہے کہ میر حسن نے قوافی اور ردیفوں کے استعمال میں بھی خاصی ہنرمندی دکھائی ہے۔ انھوں نے مشکل قوافی کو برتنے میں بھی لطف اور حسن برقرار رکھا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے:

تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ — اکیلی لگی رونے مُنھ ڈھانپ ڈھانپ

وہ آنکھیں جو روئی تھیں بس پھوٹ پھوٹ — تو گویا کہ موتی بھرے کوٹ کوٹ

نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مَہ — رہے بُرج میں یہ مَہِ چاردہ

جہاں ردیف آئی ہے تو پھر فطری معلوم ہوتی ہے جیسے قافیہ کے بعد وہی ردیف آسکتی تھی:

کٹی رات حرف و حکایات میں — سحر ہوگئی بات کی بات میں

وہ زلفیں کہ جی جن سے الجھا رہے
الجھنے سے جی ان کے سلجھا رہے

غرض لے گئی آن کی آن میں
اڑا کر وہ اس کو پرستان میں

خلاصہ:

رموز العارفین: اس مثنوی کے نام ہی سےاندازہ ہوتا ہے کہ اس کا موضوع تصوف اور رُشد و ہدایت ہوگا۔ اس مثنوی کے آغاز میں شاعر اپنی بات اس طرح شروع کرتا ہے:

عارفوں کو رمز سے آگاہ کر
ملک درویشی کا مجھ کو شاہ کر

شاعری میں عمر میں کھوئی تمام
میں نے عقبیٰ کا کیا ہرگز نہ کام

اپنی اس بے ہودگی پر ہوں خجل
شعر کہنے سے بھرا ہے میرا دل

اس مثنوی میں میر حسن نے بادشاہ ابراہیم ادھم نے بلخ کے سلطنت چھوڑ کر درویش اور فقیری اختیار کرنے کی داستان منظوم کی ہے۔ اس میں میر حسن نے جابہ جا مولانا روم کی مثنوی کے حصے شامل کرلیے ہیں اور خود بھی بہت سے اشعار فارسی میں کہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کہانی پیش کرکے معارف حق اور راہ سلوک کا درس دینے کی کوشش کی ہے۔

گلزارِ ارم: میر حسن نے یہ مثنوی 1192ھ یعنی 1778 میں لکھی۔ گلزار کا املا میر حسن نے 'گلذار' لکھا ہے جس سے اس مثنوی کی تاریخ نکلتی ہے:

سو اس کا نام گلذار ارم گلذار ارم = 1192ھ

ہے

اس مثنوی میں میر حسن نے اپنے عشقیہ رنگ کو بھی پیش کیا ہے اور اپنے عہد کے فیض آباد اور لکھنؤ کے نقوش بھی بیان کیے ہیں۔ دہلی سے لکھنؤ آتے ہوئے فیض آباد میں قیام لیکن اس سے پہلے میوات میں شاہ مدار کے مزار کا ذکر، چھڑیوں کا بیان، پھر میوات کی حسیناؤں کی آرائش و زیبائش کا بیان کیا ہے۔ چھڑیوں کا بیان ملاحظہ کیجیے:

ڈفالی واں کھڑی کرتے وہ چھڑیاں کیا بھلی

تھے چھڑیاں لگتی تھیں کھڑیاں

دیا باتی سرشب روز دیے چھڑیو ں کے
کرتے آگے لاکے دھرتے

ضلع بولے ہے کوئی، کہیں ٹھٹھا کہیں ہے
کوئی پھکّڑ دھول دھپّڑ

روا بیچے کوئی، کوئی لیے بیٹھا ہے سانڈے
کرے کھیل کا کوئی تیل

مثنوی سحرالبیان: میر حسن کی تمام مثنویوں میں قبول عام اور شہرت دوام اسی مثنوی ‘سحرالبیان’ کو ملی۔ اسی لیے اس کی طرف توجہ بھی سب سے زیادہ کی گئی۔ یہ مثنوی 1199ھ یعنی 1784 میں مکمل ہوئی لیکن اس کی اشاعت پہلی بار کلکتہ سے 1803 میں ہوئی جو کہ 152 صفحات پر مشتمل تھی۔ فورٹ ولیم کالج سے یہ مثنوی شیر علی افسوس کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

منظرنگاری یوں تو خارجی حسن کے بیان کو کہتے ہیں لیکن اس میں جان اور اثرانگیزی پیدا کرنے کے لیے شاعر کی تخلیقی قوت مستحکم ہونی چاہیے ورنہ منظر نگاری ایک سپاٹ تاثر

پیش کرسکتی ہے۔ کبھی کبھی ظاہری حسن میں حقیقت کی ایسی تصویر کشی ہوتی ہے کہ دل اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔

بات منظرنگاری کی ہورہی ہے، لہٰذا آپ غور کریں کہ میر حسن نے کس خوبصورتی سے مصنوعی باغ میں بھی خوبصورت رنگ بھر دیا ہے۔ باغ گرچہ ایران کا معلوم ہوتاہے لیکن اس باغ میں ہندوستانی پھول گیندا، موتیا، چمپا، موگرا، مدن وغیرہ بھی اپنی خوشبو بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

گلوں کا لب نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر — نشے کا سا عالم گلستان پر

چمن آتش گل سے دہکا ہوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

صَبا جوگئی ڈھیریاں پڑے ہر طرف

کرکے بھول مولسریوں کے پھول

میر حسن نے اپنی مثنوی میں انسان کے نجی اور عوامی جذبات و احساسات دونوں کی خوبصورت عکّاسی کی ہے۔ اس جذبات نگاری میں وہی منظرنگاری والی صلاحیت کام کرتی ہے۔ شہزادہ جب گم ہوجاتا ہے اور اس سے جو ماحول بنتا ہے، اس میں جذبات کا اہم رول ہے۔ یہ تین اشعار دیکھیے:

کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دل گیر ہو — گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

رہی کوئی انگلی میں دانتوں کو داب — کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب

میر حسن نے بے نظیر کے کردار کو آغاز میں فعّال اور دل چسپ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن آگے چل کر اس میں ڈھیلا پن اور جھول پیدا ہوگیا ہے۔ اس طرح اس کی ہیروئن بھی کمزور دکھائی دیتی ہے جو ہجر کے کرب کو جھیل نہیں پاتی اور مسلسل اس پر بے ہوشی کا دورہ سا

پڑتا رہتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ ملاقات کے بعد وصل کی خواہش اور اس کی طلب سے مغلوب رہتی ہے۔ اس میں ضبط کا مادّہ نہیں۔ اسی طرح ماہ رخ پری بھی عشق کے جذبے سے مغلوب دکھائی دیتی ہے۔ اس میں ایک طرح کی خود پسندی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اُسے ہمیشہ یہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ اس کی خواہش کس طرح پوری ہوسکے۔

بے نظیر کی جدائی سے جب بدرمنیر پریشان ہوتی ہے تو اس کی بیقراری کم کرنے کی غرض سے وہ جوگن کا روپ لے کر نکل پڑتی ہے۔ اسی لیے لگتا ہے کہ نجم النساء کے کردار میں جان سی پڑگئی ہے۔ اسے خود سے زیادہ دوسرے کی فکر ہوتی ہے:

لگی کہنے وہ یوں نہ ترے واسطے میں نے
آنسو بہا اب دکھ سہا

بس اب سر بہ صحرا اُسے ڈھونڈ لانے کو
نکلتی ہوں میں چلتی ہوں میں

جو باقی رہا کچھ مرے تو پھر آکے میں
دم میں دم دیکھتی ہوں قدم

وگر مرگئی، تو بلا سے موئی
تو یوں جانیو مجھ پہ صدقے ہوئی

دوسرے کرداروں میں جِنوں کا شہزادہ ہے جو عشق میں گرفتار ہوکر بھی جذباتیت کا شکار نہیں ہوتا۔ اس طرح نجم النساء اور شہزادۂ جن دونوں میں زندگی کو منطقی اور **Radical** انداز میں جینے کی صلاحیت نظر آتی ہے۔

واقعہ نگاری میں میر حسن نے کمال فن دکھایا ہے۔ چوں کہ انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اس لیے مرقع کشی میں انھیں دقت نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ نگاری بھی منظرکشی کا ساانداز پیش کرتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کھنچی چادر اک اس پہ شبنم کی صاف
کہ ہو چاندنی جس صفا کی غلاف

دھرے اس پہ تکیے کئی نرم نرم
کہ مخمل کو ہو جس کے دیکھے سے شرم

‘سحرالبیان’ کی زبان میں چُستی اور روزمرہ اور محاورے کے سبب دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔ اگر آپ میر حسن کے زمانے میں دیکھیں تو زبان بہت بالیدہ اور پختہ نہیں تھی، تاہم میر حسن نے زبان اور تراکیب کا جو خوبصورت استعمال دکھایا ہے، وہ لائق توجہ ہے۔

یوں تو شاعری کی کوئی بھی صنف ہو، مگر مثنوی کے لیے بالخصوص اسلوب اظہار میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ساتھ برجستہ اور برمحل محاوروں اور روزمرہ کا استعمال اور اہتمام ضروری ہوتا ہے۔ میر حسن نے اپنے کردارو ں کے مطابق زبان اور روزمرہ کا استعمال کیا ہے جس کے سبب اس میں اثرانگیزی اور حسن اعجاز پیدا ہوگیا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی اہمیت کا حامل ہے کہ میر حسن نے قوافی اور ردیفوں کے استعمال میں بھی خاصی ہنرمندی دکھائی ہے۔ انھوں نے مشکل قوافی کو برتنے میں بھی لطف اور حسن برقرار رکھا ہے۔

الغرض، یہ بات کہی جاسکتی ہے اردو مثنوی نگاری کی تاریخ میں میر حسن کا مقام بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں ان کی دوسری مثنویوں کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں تھا، البتہ ‘سحرالبیان’ کے جائزے سے ان کی پختہ تخلیقی صلاحیت اور قادرالکلامی کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔